إنّ من الشعر لحکمۃ

شمع سخن



مصنفہ

پروفیسر جناب سید نواب علی صاحب نواب ایم۔اے

مصنف تذکرۃ المصطفیٰ و معارج الدین وغیرہ

باہتمام کیسری داس سیٹھ سپرنٹنڈنٹ

نولکشور پریس لکھنؤ میں چھپا

۱۹۲۱ء

فہرست

تمت بالخیر



بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

اُردو شاعری نے گذشتہ صدی میں جو حیرت انگیز ترقّی کی ہے اُس کو دیکھتے ہوے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ وہی محمّد شاہی دور کا دفترِ بے معنی ہے جس کے سودائیوں کو ایک ایرانی نازک دماغ نے "پوچ گویانِ ہند" کا لقب دیا تھا غالب انیس۔ حالی۔ اکبر اقبال جس نورانی پیکر کے حواس خمسہ ہوں وہ کیوں نہ جھوم کرکہے۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

مجھے ابتدا سے شعر کا شوق تھا۔ شاید خاک لکھنؤ کا اثر ہو۔ سنہ ۱۹۲ء میں جب میں کیننگ کالج لکھنؤ میں پڑھتا تھا تو خواجہ عزیز الدین صاحب عزیزؔ مصنّف مثنوی یدِ بیضا اور منشی ابراہیم حسین صاحب ناظمؔ متبع خواجہ آتشؔ کے پاکیزہ افادات نے اس شوق کو تیز کردیا لیکن اُنھیں ایام میں حضرت مولانا و مرشدنا قدوۃ العارفین سراج السالکین حضرت شاہ ابوالاحیار

محمد نعیم انصاری فرنگی محلی کی فیض تربیت نے شعر و سخن کی بجلی کو سینہ میں بند کر دیا کہ جب ضرورت ہو زبان کا بٹن دبا کر روشن کر لیجائے۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں آب و دانہ کی کشش مدرسۃ العلوم علیگڈھ سے بڑودہ کھینچ لائی اور آج تک یہاں سے جنبش نہونے دی۔ یہاں کی معاشرت جدا۔ زبان الگ شعر و سخن کا کیا ذکر۔ ہاں کبھی کبھی ایام گذشتہ کی یاد یا حالات حاضرہ کے اثر سے کچھ کہکر رکھ چھوڑتا تھا لیکن چونکہ زبان مادری کی خدمت بھی ضروری ہے اسلئے یہ چھوٹی سی "شمع سخن" بزم احباب کے لئے نذر ہے۔

حال ارباب صفا تم پہ یہ روشن ہوجائے ہے یہ وہ شمع کہ خنداں بھی ہے گریاں بھی ہے

خدا کرے یہ اشعار جنمیں عہد جدید کے خیالات اسلامی اصول کی روشنی میں بطرز تغزل ادا کئے ہیں اس ہمہ گیر طوفان انقلاب میں سکون قلب کا باعث ہوں قال اللہ عز و جل۔

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

۱۲ فروری سنہ ۱۹۲۱ء بڑودہ

نواب

چراغِ دل

(۶- مارچ ۱۹۲۰؁ء)

اُترے ہیں جو زمیں پر روشن دماغ لیکر
وہ ڈھونڈھتے ہیں تجھکو دل کا چراغ لیکر

دنیا میں لَو لگائے تجھ سے ہیں جو۔ گئے وہ
تسکین قلب لیکر۔ نور فراغ لے کر

تہذیب مغربی کو دل دے رہے ہو۔ دیکھو
بلبل کو بیچتے ہو کیوں پرِ زاغ لے کر

ظلمتکدے میں عالم کے سوجھتا نہیں کچھ
مثل قمر چمکنا اُلفت کا داغ لے کر

دردآشنا سے دیں ہو جو دل وہ دے خُدایا
کیا فلسفہ کا چاٹیں خالی دماغ لے کر

آنے دے حشر کا دن پھر دیکھنا تماشا
مانگینگے تجھکو تجھ سے جنت کا باغ لیکر

بزم جہاں میں نواب اتنی ہی آرزو ہے
بھر دے ولا سے ساقی دل کا ایاغ لیکر

ترانۂ معرفت

(۲۱ - اکتوبر ۱۹۱۹ء)

دُور ہو دنیا کہ تجھ سے آرزو کچھ بھی نہیں
نام خود کہتا ہے یہ تیرا کہ تو کچھ بھی نہیں

اُسپہ مرمٹنا ہی اپنی زندگی اے خضر ہے
آب حیواں کیلئے یہ جستجو کچھ بھی نہیں

محفلِ اغیار میں کیونکر کہیں تجھ سے کہ ہائے!
چاہنے والوں کی تیرے آبرو کچھ بھی نہیں

فلسفی شیدائے قیل وقال اور عاشق تیرے
محو ایسے ہیں کسی سے گفتگو کچھ بھی نہیں

عکس حسنِ روئے جاناں کی ہے یہ ساری بہار
گلشنِ ہستی میں ورنہ رنگ و بو کچھ بھی نہیں

اول و آخر ہے تو اور ظاہر و باطن ہے تو
تو ہی تو ہے الغرض اور چار سو کچھ بھی نہیں

خنجرِ تسلیم سے نواب گھائل ہیں جو دل
ذبح کو اُنکے یہ خنجر بر گلو کچھ بھی نہیں

نواے دل

(۲۵-جولائی سنہ ۱۹۱۹ء)

سنتا نہیں جہاں میں کوے ماجراے دل
یارب کہاں چلے گئے درد آشناے دل

مانا کہ لب کرینگے نہ فریاد بر ملا
کوہ الم سے آئیگی لیکن صداے دل

منکر وجود دل کے ہیں جو زور و شور سے
خلوت میں کس سے کہتے ہیں وہ مدعاے دل

ہر ذرہ کائنات کا گویاے حال ہے
سمجھا نہ اسکو خاک بھی کوئی سواے دل

مجبوریاں تھیں لائیں جو رنگ اختیار کا
اے حسن یار کیا ہے سراسر خطاے دل

واقف ہوا جو لذت ادراک سے تو خیر
احساس حسن ہو تو یہ ہے ارتقاے دل

ترتیب کائنات ہے آئینہ حسن کا
وہ کون شے تھی جسکو وہ رکھتے بجاے دل
تھا قلب سادہ چاہیے "قلب سلیم[۱] ہو"
وہ ابتداے دل تھی یہ ہے انتہاے دل
اُمید وار ہیں نظر لطفِ یار کے
ہے منحصر اسی پہ فنا و بقاے دل
اے علم[۲] وہ حجاب ہو نواب کے لیے
چھپ چھپ کے جس سے جلوہ نما ہو صفاے دل

---

[۱] حق تعالیٰ فرماتا ہے اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ۔ انسان کا روحانی ارتقا قلب سلیم کا اکتساب ہے ہمنے اسکی تشریح معارج الدین حصہ اول صفحہ ۲۸ میں کی ہے ۱۲

[۲] اشارہ ہے العلم حجاب الاکبر کیطرف ۱۲

سوز دروں

(۲۸ - ستمبر ۱۹۱۸ء)

مست ہوں اُس نشے میں جس مے کا پیمانہ نہیں
منتِ ساقی نہیں غوغاے میخانہ نہیں

اے مرے اُجڑے ہوے دل تجھکو غم کس بات کا
گنج اُلفت کا دفینہ تو ہے ویرانہ نہیں

ہیں کہاں درد آشنا دل قصۂ اُلفت سُنیں
ارتقاے[1] بوزنہ کا ہے یہ افسانہ نہیں

اہلِ ظاہر سرحدِ معنٰی کریں کیونکر عبور
راہداری کا کوئی پاس انکے پروانہ نہیں

ماجراے بزمِ جاناں حق ہے حق کے منکرو!
قصۂ سوز و گداز شمع و پروانہ نہیں

کیا ہے؟ کیوں ہے یہ جہاں تو ہی بتا اے فلسفی!
میں تو دیوانہ ہوں اچھا - تو تو دیوانہ نہیں

قیمتِ دل پوچھتے ہو کس لئے نوّاب سے
دونوں عالم ہیں کوئی مثل اسکے دُرِّ دانہ نہیں

---

[1] ڈاروِن کی تحقیق کی طرح اشارہ ہے۔

نورٌ علیٰ نور

(۲۰ - دسمبر سنہ ۱۹۱۹ء)

آنکھ سے لعبتِ ہستی کا تماشا دیکھو
دل سے بازیگرِ اسرار کا جلوہ دیکھو

غلطی علمِ مناظر سے نظر کی دیکھی!
دل میں اب منعکس انوار تجلّے دیکھو

نیلگوں چرخ اگر حدِ نظر ہے۔ اچھا
دیدۂ دل نے ہے کچھ اور بھی دیکھا دیکھو

آنکھ سے روشنی مہر نظر آئے گی
دل سے حُسنِ ازلی کا بھی کرشمہ دیکھو

صورتِ عالمِ ذرّ آنکھ سے دیکھی۔ بہتر
دل سے اب معنیِ ایجاد کا نقشہ دیکھو

آنکھ پڑتی ہے کدھر۔ مادّۂ فاسد پر!
کھول کر دیدۂ دل روحِ مصفّا دیکھو

سارے عالم میں کشش آنکھ سے دیکھی کیا خوب
کششِ حسن کو بھی دل سے اب اچھا دیکھو

ارتقا آنکھ سے گر تمنے صریحاً دیکھا
"اصطفےٰ" کا بھی ذرا دل سے کنایہ[۲] دیکھو

سیکڑوں شمس و قمر آنکھ سے دیکھے تمنے
دل سے اب نورِ علی نور کا جلوہ دیکھو

پڑھ لیا آنکھ سے گو قصۂ ما قبلِ حیات
دل سے مابعد[۳] کی شکلوں کا نتیجہ دیکھو

آنکھ کے تل میں نظر آتا ہے سارا عالم
اور اُسے دل کے سویدا میں ہویدا دیکھو

دونوں آنکھوں سے جو جی چاہے وہ دیکھو ہر دم
دل سے دلدار کو اک بار خدارا دیکھو

دیکھنے والو ابھی آنکھ سے دیکھا کیا ہے
آؤ۔ نواب کے دلکا بھی تماشا دیکھو

---

[۱] اشارہ ہے اس آیہ کریمہ کیطرف اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی اٰدَمَ وَ نُوحًا وَّاٰلَ اِبْرَاھِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرَانَ عَلَی الْعَالَمِیْنَ اصطفےٰ کے متعلق "رمزِ اصطفےٰ" کے اشعار آئندہ پڑھو۔ [۲] والکنایۃ ابلغ من الصراحۃ (سورہ بقرہ) [۳] ارتقاے آئندہ یعنی معاد۔

رمزِ اصطفےٰ

(۲۳-جنوری ۱۹۲۰ء)

ارتقا ہے گرچہ ظاہر جسم انساں کے لیے
ارتقا اک اور بھی پوشیدہ ہے جاں کے لئے
عقل میں آتا ہے طبعی انتخاب انواع کا
انتخاب اک اور بھی ہے عقل وایماں کے لئے
ارتقاذرّات عالم کے لیے۔ اور اصطفےٰ[1]
آدمؑ و نوحؑ۔ آل ابرائہیم و عمراں کے لئے
فیض ہے عام اُسکا لیکن جوہر قابل ہے شرط
بحر و بر سب ہے برابر ابر نیساں کے لئے

---

[1] سورہ آل عمران میں حق تعالےٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰھِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ۔بقائے اصلح کے مقابلہ میں یہ الٰہی قانون "اصطفےٰ" ہے جس پر شیدائیان ڈارونیت غور نہیں کرتے۔

سیکڑوں غولانِ وہم اور راہ تاریک و دراز
رہنما پیدا نہ کیوں ہوں راہِ عرفاں کے لئے

علم جو معلوم تک پہونچائے وہ ہے اور ہی
درسِ دانائی ہے آساں ورنہ ناداں کے لئے

عقل کیا ہے اصل میں یہ اونٹ کی ہے اک نکیل[1]
نغمۂ "اوحی"[2] کی حاجت ہے حدی خواں کے لئے

وحی نورانی گراموفون کی آواز ہے
پردۂ بے پردۂ حق رازِ پنہاں کے لئے

دوڑتی پھرتی تھی بجلی کیطرح آوازِ حق
سارے عالم میں ۔ ہوئی پھر بند قرآں کے لئے

یہ پیام آخری ہاں ارتقائے روح ہے
رحمۃ للعالمیں ہیں فخرِ دوراں کے لئے

واہ کیسا صاف ہے اب راستہ توحید کا
شرک کے کانٹے کہاں ہیں دل کے داماں کے لئے

---

[1] عقل کا مادہ "عقال الابل" ہے یعنی اونٹ کے نکیل [2] فاوحی الی عبدہ ما اوحی کیطرف اشارہ ہے ۱۲

مثل قانونِ کشش یہ دیں ہے سب کو کھینچتا
حسن انساں کے لیے زنجیر شیطاں کے لیے
"عالمِ اصغر" ہے انساں کی طرح اسلام بھی[1]
جس سے ہے ختم نبوت نوعِ انساں کے لئے
پیروی احمدؐ مختار کر نوآب تو
ذاتِ اقدس ہے بڑی نعمت مسلماں کے لیے

---

[1] حکما انسان کو عالم صغیر کہتے ہیں۔ دنیاے مذہب میں اسلام کا بھی یہی حال ہے اور آنحضرت صلعم خاتم الانبیا ہیں عالم خلق میں جسطرح انسان دنیاوی مخلوقات کی ترقی کا خاتم تسلیم کیا گیا ہے اور کوئی عاقل یہ نہیں اعتراض کرتا کہ کیا مصورِ حقیقی کا خزانہ خالی ہو گیا جو یہ سلسلہ موقوف ہو گیا اسیطرح عالم امر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ادیان کے نشو و نماے کامل کے خاتم ہیں اور کوئی سمجھدار یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ نورانی دائرہ محدود اور یہ روحانی دروازہ مسدود کیوں کر دیا گیا۔

ذوقِ شہود

(۱۸- جنوری سنہ ۱۹۲۰ء)

دیکھ حق کے فعل کی بیواسطہ تاثیر کو
توڑ بھی دے علت و معلول کی زنجیر[1] کو

---

[1] حکما جسے علت و معلول کا سلسلہ سمجھتے ہیں وہ اصل میں محض مقدم و موخر کا ظہور ہے جو ایک مقررہ ترتیب کے ساتھ نظر آرہا ہے۔ فاعل اور موثر حقیقی اصل میں وہی ذات پاک ہے۔ سورۂ واقعہ میں ایک مقام پر مذکور ہے أَفَرَءَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُۥٓ أَمْ نَحْنُ ٱلزَّٰرِعُونَ۔ الآیہ (ترجمہ) کیا تم نے دیکھا جو بوتے ہو کیا تم بوتے ہو اُسے یا ہم ہیں بونے والے الخ) حق تعالیٰ نے ان آیات میں تین مثالوں کیطرف اول دلائی اول کھیتی۔ دوم پانی پینے کا۔ سوم آگ جلانے کے ان تینوں مثالوں میں افعال کو بلا واسطہ اپنی طرف منسوب کیا ہے تاکہ انسان جسکے دماغی قوتوں نے قوانین قطرت کے عظیم الشان مشین کے کُل پرزوں کو دریافت کرکے عناصر کو مسخر کیا ہے اسباب و علل کے چکروں میں اپنے دامن دل کو اُلجھنے نہ دے۔

عقدۂ نظم جہاں اور اُسکو کھولے اِتّفاق
دخل ہے البتہ اسمیں ناخن تدبیر کو
واہ کیسا وہ ہیولانی[1] غبار افلاک کا
آنکھ میں ساقی کے دیکھو سرمہ کی تحریر کو
سیکڑوں عالم بنیں۔ بگڑیں غرض جو کچھ بھی ہو
ہم ہیں اور دلمیں چھپائے یار کی تصویر کو
کس سے روشن ہیں زمین و آسماں کون و مکاں
دور بیں دل کی لگا کر دیکھ اس تنویر کو
کاش پیدا تجھ میں بھی ہو جائے یہ ذوق شہود
فلسفی رہنے بھی دے بس ختم کر تقریر کو
جو ہوا۔ ہونا ہے۔ ہوگا سب ہے اس کے حکم سے
روئیے نواب کیوں تدبیر کو تقدیر کو

---

[1] ہیولانی غبار سے مراد "ہیولا" ہے جو آسمانوں پر آتشی کُہرے کیطرح بادل کی شکل میں نظر آتا ہے خیال کیا جاتا ہے کہ بے شمار دنیائیں اور سیارے اسی بقعۂ نور سے بنے ہیں۔

قطعہ

پہلے ابن اللہ تھے۔ ہیں آج نسناسی[۱] نژاد
یا تو وہ توقیر یا دیکھو تو اس تحقیر کو
ارتقائی خاک بھی سمجھا نہ رمز اصطفےٰ
بندش قانون فطرت یاد ہے بے پیر کو

قال و حال

(۱۹- جنوری ۱۹۲۰ء)

دیکھو جسے وہ شیفتہ ہے قیل و قال کا
عالم مگر کچھ اور ہے شیدا اسے حال کا

---

[۱] نسناس بھتنے بن مانس۔ عیسائیوں میں سینٹ پال نے سب سے پہلے حضرت مسیحؑ کو "ابن اللہ" کہا اسطور سے ابن آدم کا سلسلہ نسب خدا سے ملا دیا۔ اٹھارہ سو برس کے بعد ڈارون اور اسکے متبعین ہکسلی اور ہیکل نے نسل آدم کا سلسلہ بندروں سے ملا دیا!

اُسکو ثبوت حُسن کی درکار ہے دلیل
یہ دیکھتا ہے آنکھ سے جلوہ جمال کا
برہان سُلّم اُسکی ہے معراج علم وفضل
ذوق سلیم اِسکا ہے زینہ کمال کا
عین الحیاتِ عقل کی اُسکو تلاش ہے
میدانِ عشق میں ہے یہ تشنہ وصال کا
آغاز کائنات کا وہ قصہ خواں ہے بس
ہردم اسے خیال ہے لیکن مآل کا
اُنکی کیف وکم سے اُسے بحث ہر گھڑی
پردہ اُٹھاتا ہے یہ شیونِ ظلال کا
پیش نظر ہے اُسکے معائنے کائنات
سنتا ہے یہ جواب "ارنی" کے سوال کا
مرتا ہے اپنی "لاادریت" وہ اگر
دیوانہ ہے یہ حسن رخ لایزال کا
نواب قال وحال کی کب تک یہ گفتگو
تونے بھی باب کھول دیا قیل وقال کا

حسن

ایمان بالغیب

(۲۱ - جنوری سنہ ۱۹۲۰ء)

چھپا ہمسے رہیگا تو کہاں تک
نظر پہنچی ہے اپنی لامکاں تک

وہی اک عکس ہے سب میں نمایاں
بھرے آئینہ خانے میں جہاں تک

نمود و بود کیا ہے ۔ خیر و شر کیا
ہیں تیری یاد میں بھولے یہاں تک

کبھی تجھسے نہ منھ موڑونگا ہرگز
ستالے ۔ ہاں ستاتا ہے جہاں تک

چلا بھی راہ میں چل گرتے پڑتے
پہنچ جائیگا آخر کارواں تک

بھلا پہنچیں گے وہ کیا جان جاں تک
نہ پہنچی عقل جنکی حد جاں[1] تک

وہ کیا سمجھیں گے معنی محبت
نہیں سنتے ہیں جو غم کا بیاں تک

وہ کیا جانیں ہے کیا ایمان بالغیب
رسائی جنکی ہے علم اللساں تک

بچھا ہے آنسوؤنکا سرخ اک فرش
حریم جاں سے اُسکی آستاں تک

ترا دلکش ہے قصہ عمر کوتاہ
نہ آئی نیند ختم داستاں تک

پتہ نواب داغ دل سے پوچھیں
پہنچنا ہے جنھیں اُس بے نشاں تک

---

[1] یعنی جنھوں نے روح کو "پروٹوپلیزم" (مادۃ الحیات) سمجھ رکھا ہے اور اسکو مادی خیال کرتے ہیں۔

سرودِ محبّت

(۲۰- فروری ۱۹۱۹ء)

کس مزے کے ہیں ترے در کی گدائی کے مزے
ہیچ ہیں واقعی سب دولت و شاہی کے مزے
ساری قیدوں سے چھڑایا تری اُلفت نے مجھے
مجھ سے پوچھے تو کوئی میری رہائی کے مزے
چپکے چپکے دل و دیں تو نے تو لوٹے لیکن
ہم نے لوٹے تری دزدیدہ نگاہی کے مزے
واہ کیا وادیٔ ایمن میں بھٹک کر پہنچے
گمرہی میں ہیں تری راہ نمائی کے مزے
فلسفی رہنے دے قانونِ شہادت اپنا
تو نے چکھے ہی نہیں دل کی گواہی کے مزے
اسکے بندوں کے مزوں سے نہیں واقف دُنیا
لوٹ کر لیگئے وہ ساری خدائی کے مزے
آبِ حیواں میں بھی نوّاب نہیں ملنے کے
ظلمتِ شب میں جو ہیں یادِ الٰہی کے مزے

لذّتِ اظہار

(۱۱۔ستمبر سنہ ۱۹۱۰ء)

حسن کب شیفتۂ لذّتِ اظہار نہ تھا
شعلۂ طور نہ تھا۔ گرمیِ بازار نہ تھا؟

نقدِ دل دینے میں کچھ ہمنے تامّل نہ کیا
جب کوئی جنسِ امانت کا خریدار نہ تھا

میری ایسی کوئی کیوں کہنے لگا محفل میں
دل جو پہلو میں ہے جب وہ ہی طرفدار نہ تھا

شورِ اعجازِ مسیحا کا سُنا ہے لیکن
کیا کوئی عشق کا اُس عہد میں بیمار نہ تھا

قصۂ سوزِ دروں شمع نے چھیڑا لیکن
میں نے دیکھا تو کوئی بزم میں بیدار نہ تھا

کششِ ثقل کو ثابت کیا جس نے نواب
کششِ حسن سے شاید کہ خبردار نہ تھا

کششِ حسن

(۲۵-جنوری سنہ ۱۹۲۰ء)

مادّے میں ہے کہاں یہ مادہ[1] دل کھینچ لے
عاقل و بینا کو کیونکر کور و جاہل کھینچ لے

سامنے تیرے نظر غیروں پہ ڈالیں مدعی
خنجرِ غیرت کمر سے اپنے قاتل کھینچ لے

میں ہوں مائل حسن پر نیوٹن کشش کا مدعی
اپنی اپنی سمت ہو جو حق کا قائل کھینچ لے

ہیچ ہیں سب لذتیں اُسکی کھٹک کے سامنے
تیر تیرا دل سے کیونکر تیرا گھائل کھینچ لے

ہمسری کا تجھسے دعوی ہو کسے اے جان جاں
اپنی ہی تصویر اک اپنے مقابل کھینچ لے

---

[1] اصطلاح حکما میں مادہ کو "اعمی" کہتے ہیں اور دل کو محل ادراک ۱۲

حُسن کا دیوانہ پھنسنے کا نہیں - ہشیار ہے
ارتقا کی "آخری زنجیر" ہیکل کھینچ لے
مدوجزر بحر کا نوابِ عالم دل میں ہے
کیوں نہ دنیا میں تجھے وہ بدر کامل کھینچ لے

لہ ڈاروں کا پرجوش متبع اُسنے ایک کتاب لکھی ہے جسکا نام "لاسٹ لنک" ہے یعنے آخری کڑی یا زنجیر اسمیں اسنے انسان کا شجرہ بندروں سے ملا دیا ہے ۱۲

نغمۂ مستانہ

(۴ - دسمبر ۱۹۱۸ء)

ساقی کی بزم میں نہیں کچھ شیخ و شاب مست
پیمانہ مست۔ مست لب مے۔ شراب مست

پھرتے ہیں کسکی شوق لقا میں یہ روز و شب
سیّارے مست مست قمر۔ آفتاب مست

ہنستا ہے کوئی روتا ہے کوئی یہ کس لئے
شبنم ہے مست۔ مست ہے برق و سحاب مست

کیا حال ہو جو رُخ سے اُٹھائے نقاب تو
رکھتا ہے جب جہاں کو یہ تیرا حجاب مست

بجتا ہے ساز پردۂ دل ہی مین مست ہیں
حاجت نہیں کریں ہمیں چنگ و رباب مست

رہنے دے اپنی جنت و دوزخ کو واعظا
کرتے ہیں کب خیالِ عذاب و ثواب مست

نواب اثر ہے آپ کے نغمات مین عجیب
ہے بزم مست۔ مست صنم خود جناب مست

زمزمۂ توحید

(۲۱ - جنوری ۱۹۳۰ء)

صانعِ دہر کا ہے جلوۂ اظہار جدا
ایک گلبن ہے مگر گل ہے جدا خار جدا
بزمِ عالم کی دورنگی کا ہے کیسا عالم
شمع ہے ایک مگر نور جدا نار جدا
جب سے اُس جنسِ امانت[1] کا خریدار آیا
خیر و شر دونوں کی ہے گرمیِ بازار جدا
کششِ یار نے دونوں کو کیا جمع مگر
بزم میں غیر سے ہے محرمِ اسرار جدا
کس نے چھڑکی ہے یہ ذرّاتِ جہاں کی افشاں
مست عالم ہے جدا - طالبِ دیدار جدا
کشش و جذب کی خلعت کو عطا کس نے کیا
ہوتا دستارِ جہاں سے نہیں اک تار جدا

---

[1] اشارہ ہے اس آیت کی طرف انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوات... الآیہ ۱۲

محو دیدار کو تو ہی نظر[1] آیا ہر سو
گرچہ آتے ہین نظر یار سے اغیار جدا

خالقیت کی ہے نسبت کا ادب[2] پیش نظر
جاننے والے تجھے کہتے ہیں ناچار جدا

غم و شادیِ جہاں سے اُسے آزادی ہے
سب سے آتا ہے نظر تیرا گرفتار جدا

اتنی ہے عرض اُسے دامنِ رحمت مین چھپا
جاں ہو نوّاب کی جب جسم سے ستّار جدا

---

[1] و [2] مسلک توحید مین حضرات صوفیہ کرام کے دو گروہ ہیں وجودیہ یعنی قائل ہمہ اوست اور شہودیہ یعنی ہمہ از دست کے قائل۔ گروہ اول کے پیشرو حضرت شیخ اکبر ہیں اور گروہ ثانی کے حضرت مجدد الف ثانی۔ صوفیہ وجودیہ خدا کو وجود حقیقی کے ساتھ موجود یقین کرتے ہیں اور عالم کو مرتبہ وہم میں سمجھتے ہیں اور اُسکا مستقل وجود قرار نہیں دیتے جیسے دریا میں موج یا تاگے میں گرہ۔ لیکن یہ ایک ایسا مشاہدہ حال ہے جسکی تشریح زبان قال سے اکثر گمراہی کا باعث ہو جاتی ہے اسطور سے کہ حق تعالیٰ کو بمنزلہ طبعی کلی کے خیال کیا اور اشخاص ممکنات کو اسکے افراد جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ نسبت خالقیت کو نظر انداز کرکے ہنود و نصاریٰ کی طرح اتحاد و حلول کے قائل ہو گئے۔ حضرت مجدد نے اسی نسبت خالقیت کے ادب کے لحاظ اور نافہمون کے اصلاح خیال کے باعث حقائق ممکنات کو اعدام اضافیہ یعنے نقائض صفات الٰہیہ قرار دیا جو صرف تعقل میں جدا معلوم ہوتے ہیں حالانکہ خارج میں انکا کوئی جداگانہ وجود نہیں ہے یہی مطلب ہے لا عین و لا غیر کا جسکو انکی اصطلاح میں دائرہ ظلال کہتے ہیں۔

لذّتِ ذکر

(۵- فروری سنہ ۱۹۳۰ء)

ذکر کرتے ہیں اگر دن کو ترا یاروں میں
ظلمتِ شب میں تجھے ڈھونڈتے ہیں تاروں میں

دن کو بے تار کا پیغام ہے گر ذکرِ خفی
رات کو اڑتے ہیں تسبیح کے طیّاروں میں

بھیجتا ہے انھیں مریخ یہ ہر شب پیغام
شعلۂ شوق چھپا ہے مرے انگاروں میں

رات کو چپکے سے الفت کا ہیں سودا کرتے
دن کو پھرتے ہیں جو شیدا ترے بازاروں میں

کیا ہی عالم ہے نرالا ترے بیماروں کا
لذّتیں ان کو نئی ملتی ہیں آزاروں میں

بادۂ ذکر کا ساقیِ ازل کیا کہنا
بزمِ عالم میں سبھی ہیں ترے سرشاروں میں

طپشِ عشق سے سورج ہے تڑپتا ہر دم
بجلیاں کوند گئیں شوق کی سیّاروں میں
مجھکو تو عالمِ انوار کا جلوہ دکھلا
ہے شمار اب تو زمیں تیرا بھی سیّاروں میں
فکر میں طالبِ دنیا ہیں سدا ڈوبے ہوئے
راتدن ذکر ترا تیرے طلبگاروں میں
ذکر کا ذکر ہے کیا اب ہے یہ عالم **نواب**
ذکر کرتا ہے اگر کوئی تو اخباروں میں

کشفِ باطن

(۶ - فروری سنہ ۱۹۲۰ء)

چون وچرا سے طے نہ ہوئی راہ آج تک
کھینچی نہ دل سے آہ رسا آہ آج تک

پیشِ نظر ہے صنعت عالم کا آئنہ
نکلی نہ پھوٹے منھ سے مگر واہ آج تک

سمجھایا فلسفہ نے کہ سمجھے نہ کچھ بھی ہم
عقدہ کھلا نہ دہر کا واللہ آج تک

دل عاشقوں کے وادیِ ایمن سے کم نہیں
ملجاتی راہ ہے انھیں ناگاہ آج تک

عالم کو کس نے راہ پہ ایسی لگا دیا
ہے ایک ذرّہ بھی نہیں بیراہ آج تک

جھانکینگے تجھکو روزنِ دل ہی سے چھپ کے ہم
نظروں سے ہے نہاں تری درگاہ آج تک

نواب دل کے عرش پہ وہ دیکھتا ہے کون
اب تک کہاں تھے آپ یہ اخاہ آج تک

شمع عرفان

(۱۵۔ اگست ۱۹۲۰ء)

شکایت ہے نہ شکوہ کچھ تری بے اعتنائی کا
فقط رونا ہے سوزاں آہ دل کی نارسائی کا

ترے غم میں حقیقی راحت کونین ملتی ہے
صلہ ہے سرمدی دولت ترے در کی گدائی کا

چراغ راہِ عرفاں داغ ہے تیری محبت کا
بہشت جاوداں ہے خار تیری آشنائی کا

کشش کیسی کہاں کا جذب اے سائنس کے شیدا
کرشمہ ہے یہ درپردہ اسی کی دلربائی کا

گرائے دہریوں نے تالیوں سے علم کے جگنو
کہاں جلوہ ابھی دیکھا ہے حق کی روشنائی کا

ہے اسباب وعلل پر فلسفی تکیہ ترا۔ لیکن
محبت نے لیا ذمہ ہے میری رہنمائی کا

گلستانِ جہاں میں باغباں نے پھول بوئے ہیں
کھٹکتا ہے مگر دل میں ترے کانٹا بڑائی کا

طلب میں چشمۂ حیواں کے سرگرداں نہیں پھرتے
جنابِ خضرِ عالم ہے عجب دل کی صفائی کا

ہوا معلوم یہ ہمکو "نہیں معلوم ہے کچھ بھی"
بھرم اے عقل سارا کھل گیا تیری رسائی کا

تجھی کو فلسفہ بھی مانتا مذہب بھی ہے لیکن
وہ قائل علّتوں کا ہے۔ یہ تیری کبریائی کا

یہ مانا لامکاں ہے بے نشاں ہے وہ مگر پھر بھی
دلِ شیدا کو ہے نواب سودا جبہہ سائی کا

آئینۂ عالم

(۴۔ اکتوبر ۱۹۳۰ء)

تجاذب کے ۔کشش کے عاقل و فرزانہ قائل ہیں
ترے دیوانے کھنچتے ہیں تری سو تجھ پہ مائل ہیں

دماغِ فلسفی اک چور خانہ ہے تعقّل کا
مگر جو مہبطِ انوار ہیں عشّاق کے دل ہیں

کہاں ہے عشق پر پردہ ذرا بھی سب حال کھل جائے
حجابِ علم ہے کہتے جو کچھ اسپنسر ومِل ہیں

یہ معلومات ہیں یا دل پہ پردے پڑتے جاتے ہیں
وہ غافل تھے جو جاہل تھے ۔ ہیں بیگانہ جو عاقل ہیں

تنازع للبقا کا کشتہ ہے مردار آخر کو
تڑپنے میں بھی کرتے رقص ہیں تیرے جو بسمل ہیں

نہیں ہیں مسئلے یہ روشنی کے اور گرمی کے
کسی کے حسن عالم سوز کے روشن دلائل ہیں

دلِ نواب آئینہ ہے ۔ عالم بھی ہے آئینہ
تماشا دیدنی ہے دونوں آئینے مقابل ہیں

پردۂ حجاب

(۳۰ - جولائی ۱۹۲۰ء)

کھولینگے آپ بند وہ اپنی نقاب کے
دیکھیں گے حوصلے دلِ خانہ خراب کے

اے شوق ایک شعلہ بھڑکنے کی دیر ہے
حائل ہیں گرچہ سیکڑوں پردے حجاب کے

آنکھیں ہیں فرشِ راہ ترے انتظار میں
کب سے بھرے ہوئے ہیں یہ شیشے گلاب کے

شاید کسی کے ہجر میں حالت ہوئی ہے یہ
آتے نظر ہیں دور سے داغ آفتاب کے

مستی اثر ہے ساقیِ ہوش کی آنکھ کا
قائل نہ ہونگے ہم کبھی کیفِ شراب کے

(قطعہ)

بود و نمودِ دہر کی یہ کائنات ہے
دریا میں تیرتے ہیں کٹورے حباب کے

موت و حیات یہ ہے کہ نیند آگئی ہمیں
سنتے ہی سنتے رات کو افسانے خواب کے

ثواب واعظوں کی ہوس کچھ نہ پوچھئے
بھوکے ہیں خلد میں بھی شراب و کباب کے

نقاب بے نقاب

(۵۔ دسمبر ۱۹۱۸ء)

تاب نظارہ کسے دیکھے جو تجھکو بے نقاب
خیرہ ہو جاتی ہیں آنکھیں پیش تاب آفتاب
چشم فتاں سے تری ہے اک جہاں مست و خراب
زلف پیچاں سے تری عالم میں ہے یہ پیچ و تاب
حسن بے پروا جفا و جور کی کچھ حد بھی ہے
دیکھی ہے جاں بلب عاشق کی اب طاقت جواب
کرکے شوخی چھپ رہی کیوں ناز سے پھر آنکھ میں
اے نگاہِ یار یہ کیسا ہے بے پردہ حجاب
یاد ما زاغ البصر کی وہ نظر بازی بھی ہے[1]
کیوں۔ تری اُس لن ترانی کا تھا یہ کیسا جواب

[1] حضرت موسیٰ کو رویت کے سوال کے جواب میں "لن ترانی" خدا نے فرمایا لیکن آنحضرت صلعم کے نسبت واقعہ معراج میں ارشاد ہوتا ہے "ما زاغ البصر وما طغیٰ"۔

فرق تیری بے مثالی کے یقیں میں کچھ نہو
مجھکو بے پردہ نظر تو آئے یا زیرِ نقاب
کس سے دیں تشبیہ تجھکو جاننے والے ترے
ذات تیری بیمثال اور حُسن تیرا لاجواب
میرے اعمالونکا نامہ گر کبھی کھولا گیا
میں بھی گنوا دونگا تیری بخششیں روزِ حساب
ساری دولت ملگئی نواب دنیا کی تو کیا
اک دلِ بریاں خدا دے اور دو چشمِ پرآب

اَسرارِ قدم

(۲۹ - جنوری ۱۹۳۰ء)

عوالم جب کہ ظلمت میں نہاں تھے
ترے "ہم کنزِ مخفی" پاسباں تھے

یہ عالم جبکہ تھا اک سازِ خاموش
حریمِ قدس میں ہم سبحہ خواں تھے

نہ تھے قانونِ فطرت جبکہ نافذ
کتابِ اَمر[1] کے ہم نکتہ داں تھے

نہ تھا جب مادّے کا بھی ہیولیٰ
مکانِ لامکاں میں ہم نہاں تھے

یہ ذرّے منتشر سب تھے ۔ مگر ہم
فضائے نور میں برقِ طپاں تھے

---

[1] قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کی طرف اشارہ ہے۔

نہ تھی جب گرمیِ بازارِ اشیا
متاعِ حسن کے ہم کارواں تھے
نہ ہوتے ہم تو وہ غائب ہی رہتا
نشانِ بے نشاں کے ہم نشاں تھے

ہیولیٰ و عرض لُطفِ بیاں سے تھے
جو اُدھر داستانِ پاستاں سے تھے
انرجی[1] "کیسی - کیا "فورس" ایدل
کرشمے اُسکی قدرت کے عیاں سے تھے

یہ پُر پیچ ارتقا کا زینہ کیسا
عیاں اُس ذی المعارج[2] کے نشاں سے تھے
عناصر کی تھیں رنگ آمیزیاں کب
مُصوّر کے یہ سب دلکش سماں سے تھے

---

[1] "انرجی" یعنی طاقت مادہ - فورس یعنی قوت مادہ - ماہرینِ سائنس کے نزدیک یہ دونوں مادے کی ازلی صفات ہیں۔ [2] خدا کی صفت "ذی المعارج" ہے جیسا کہ سورہ معارج میں ارشاد ہوا ہے۔

نہ تھا حکمت سے کوئی فعل خالی
تنازع تھا نہ جورِ آسماں تھے
نہ تھے نواب جب اُس سے جدا ہم
یہ خیر و شر کے تب جھگڑے کہاں تھے
وہی تھا۔ ہے وہی۔ وہ ہی رہیگا
اِس عالم سے عبث ہم بدگماں تھے

(قطعہ)

تری تحقیق نے غم کو بڑھایا
عبث سائنس تیرے مدح خواں تھے
زمیں بھی اب تو اک ستارہ نکلی
ابھی تک ہم پہ جورِ آسماں تھے

حجابِ علم

(۲۵- جنوری ۱۹۲۰ء)

مادّیت تو نے ویراں باغِ عرفاں کر دیا
چلتے جادو نے ترے انساں کو حیواں[1] کر دیا

چل سکا تجھ سے نہ اشیا کی حقیقت کا پتہ
عَلَّمَ الْاَسْمَاءَ سے بھی تو نے ناداں کر دیا

یہ ستم ایجادیاں ہیں یا ترا سائنس ہے
عقل کے جوہر کو کوہِ آتش افشاں کر دیا

حشر میں کل اک جہنم اور ہونا چاہیے
آج دنیا ہی کو تو نے جبکہ نیراں کر دیا

انکشافات اور دل پر پردۂ غفلت یہ کیا
تو نے مشکوٰۃ جہاں کو طاقِ نسیاں کر دیا

چھا گیا جب سے تنازع للبقا کا زنگ آہ
محو دل سے تو نے عکسِ روئے جاناں کر دیا

---

[1] ڈارون کی تحقیق کی طرف اشارہ ہے ۱۲

سامنے بھولے سے بھی حق کے نہیں جھکتے ہیں اب
بچۂ آدم کو تو نے حیف شیطان کر دیا

یہ ہوائے نفس کی گرمی کی سرگرمی ہے سب
لالہ زار قلب کو جس نے بیابان کر دیا

صلح کے پردے میں یہ ریشہ دوانی کیوں نہ ہو
جنگ عالمگیر کا سب تو نے ساماں کر دیا

تیرے ایجادات نے اخلاق کے ملبوس میں
اسقدر جدت پسندی کی کہ عریاں کر دیا

تو نے مذہب کو کیا مانند یوسف متہم
یہ نہ دیکھا خود ہی اسکا چاک داماں کر دیا

ایکدن مثل زلیخا تو بھی ہو گی منفعل
پاک دل کو آج اگر زنداں کا خواہاں کر دیا[1]

پُر خطر ہے کسقدر منزل حجاب علم کی
راستہ قرآن نے نواب آساں کر دیا

---

[1] حضرت یوسفؑ نے کید زلیخا سے تنگ آکر قید میں جانیکی دعا فرمائی تھی رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ ۱۲

دورِ جدید

(۲۹ - اگست سنہ ۱۹۳۰ء)

گردش میں ہے زمیں بھی اب گردشِ زماں سے
حاصل سکون اے دل ہوگا تجھے کہاں سے

غُل ہے کہ ہو رہی ہے طے منزلِ ترقّی
دیکھو تو دور ہوتے جاتے ہیں کارواں سے

مانوس ہیں قفس سے ایسے کہ چھوٹ کر بھی
جاتے نہیں ہیں اُڑ کر صیّاد کے مکاں سے

مریخ و ماہ سے بھی ہونے لگے اشارے
کچھ اور سیکھنا ہے کیا جورِ آسماں سے

مٹّی کے پُتلے اُڑ کر طیّاروں میں چلے ہیں
لائیں گے توڑ خوشہ پروین کا آسماں سے

قصہ ہے ارتقائی بیشک عجیب تیرا
دلکش کہاں ہے لیکن اُلفت کی داستاں سے

عاشق کی زندگی بھی بجلی کی روشنی ہے
تارِ نفس ہے روشن بیتابیِ نہاں سے

نواب ناتوانی کام آگئی ہمارے
اُٹھتا نہیں سر اپنا اب اُن کے آستاں سے

حیاتِ طیبہ

(۷- فروری ۱۹۳۰ء)

چاہتے کب ہیں- تجھے رسوا کریں — زور آنکھوں پر نہیں کچھ کیا کریں

آرزوئیں کی مری کچھ حد بھی ہے — دوسرا عالم نہ کیوں پیدا کریں

زندگی میں بس یہی کوشش رہی — بعد مرنے کے تجھے دیکھا کریں

آج تابِ دید ہے کسکو یہاں — کیوں نہ وہ پھر وعدۂ فردا کریں

چاہتے ہیں گر حیاتِ طیبہ[1] — پیرویِ ملّت بیضا کریں

بزمِ عالم میں ہم آئے اسلئے — راگ تیرا ہی سدا گایا کریں

سیکڑوں جانیں ہوں گر تجھ پر نثار — ایک جاں[2] کی کسلئے پروا کریں

شاعری کیسی یہ ہے اظہارِ درد — خوف سے ایطا کے کیوں اخفا کریں

یوں بسر کر زندگی نواب تو

یاد گبر و مومن و ترسا کریں

---

[1] اشارہ ہے فلنحیینہ حیوۃً طیبۃ کے طرف [2] عیوب قافیہ میں ایک ایطا بھی ہے جسکی دو قسمیں ہیں (۱) ایطاءِ جلی یعنی وہ ردی جسمیں لیاقت اصل ہو نیکی نہو بلکہ وہ قابل دخیل ہو جیسے دیکھا اور گایا (۲) ایطاءِ خفی وہ الفاظ جس میں تکرار قافیہ ظاہر نہو جیسے دانا اور بینا

(قطعہ)

اصل پردہ آنکھ کا پردہ ہے بس — مرد و زن دونوں مگر ایسا کریں
جب نظر بازی کا ایکا عام ہو — صنف نازک کیوں نہ پھر پردا کریں

(دیگر)

ہم ہیں جب شیدائے رنگ مغربی — بیبیاں بھی کسلئے پردا کریں
اشک کے مانند جب ہم گر پڑے — کیوں نہ مثل آہ وہ نکلا کریں

سلہ خدا نے جسطرح عورتوں کو حکم دیا قُل لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا اسیطرح مردوں کیلئے فرمایا قُل لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ پردہ کی اصل غائت یہی ہے ورنہ اگر غور سے دیکھو تو بہت سے پردہ دار حقیقتًا بے پردہ ہیں اور بہت سے بے پردہ پردہ دار ہیں۔ نگاہ کا پردہ اصل پردہ ہے اگر دنیا میں نامحرم مرد و عورت دونوں اس پر سچے دل سے عمل پیرا ہوں تو ظاہری لباس کے سوال کو انسانی طرز معاشرت جو زمانہ کے ساتھ بدلتی رہتی ہے خود بخود حل کر دیگی۔ لیکن چونکہ خواہش نفسانی پردہ کے اصل غائت کے سدِ راہ ہو جاتی ہے خاصکر اس پُر فریب اور حیا سوز مغربی تہذیب کے دور میں اسلئے اسلامی طرز معاشرت کا پردہ بھی مومنات کے لئے ضروری ہے

نظامِ مذہب

(۲۶ جنوری سنہ ۱۹۱۳ء)

نظامِ شمسی کی طرح دُنیا میں ہے جدا اک نظامِ مذہب
زمینِ دل کھینچتا ہے ہر دم یہ ماہ محشر خرامِ مذہب

وجودِ عالم ہے گرد "ہیولا"[1] کی شعلہ افشانی کا تماشا
بنایا سوزِ دروں سے حق نے قضائے جاں میں قوامِ مذہب

جنہیں ہوا انکار جائیں بھی وہ مرا تو مشرب ہے شربِ دائم
ازل میں ساقی نے بھر دیا ہے "بلیٰ" کے بادہ سے جامِ مذہب

وہ آئینہ علمِ دہریہ ہے کہ رو تو روشن ہے پشت تیرہ
اِدھر بھی روشن اُدھر بھی روشن دو دم ہے دیکھو حسامِ مذہب

فساد کی جڑ وہ خود ہیں کہتے جو فتنہ پھیلا رہا ہے مذہب
تمام ڈوبا ہے درد ہی میں سُنیں تو آکر کلامِ مذہب

---

[1] یعنی ہیولانی غبار نور جسکی شرح "ذوق شہود" میں بیان ہو چکی ۱۲

ہیں طفل سائنس شوخ دیدہ رہینگے کورے یہ علمِ حق سے

خمیر دل کا ادب ہے جنکے وہ کرتے ہیں احترام مذہب

اگرچہ سائنس ہے وہ گھوڑا جو برق رفتار و بادپا ہے

مگر یہ سرکش ہے تُند بھی ہے چڑھا دو منہ میں لگامِ مذہب

اصول اسلام جسقدر ہیں وہ دلمیں چُھبتے ہوے ہیں بیشک

رہیگا تا حشر دین کامل حریم دل میں امامِ مذہب

جو زندگی کی ہے رات کالی تو کاٹ دے اسکو یادِ حق میں

دکھائیگی جلوہ حقیقت یہ صبحِ محشر میں شامِ مذہب

زبان سے اقرار دلمیں ایماں طریق نواب حق کا یہ ہے

جو دلمیں ہو وہ زباں سے کہنا نہ کرنا بدنام نامِ مذہب

احدی الحُسنَیَین

(۲۲-جنوری سنہ ۱۹۳۰ء)

دور میں لا عقل کی یا قلب کا آئینہ دیکھ
دیکھنا ہے گر تجھے کچھ جلوۂ جانانہ دیکھ

گر خرابات جہاں میں ذوق مستی ہے تجھے
چشم ساقی دیکھ یا پھر گردش پیمانہ دیکھ

دل میں تیرے درد کی گر کچھ کھٹک موجود ہے
نغمۂ بلبل کو سن یا سوزش پروانہ دیکھ

چاہتا ہے ہاتھ آئے گر ترے گنج مراد
مکتب حکمت میں جا یا قلب کا ویرانہ دیکھ

روشنیِ عقل میں قانون فطرت پڑھ۔ مگر
نور قرآں ہے جو خوشنودی کا اک پروانہ دیکھ

اُسکا ہو جا جان و دل سے پہلے پھر ہے اختیار
بحث آزادانہ کر یا اُسکو بے باکانہ دیکھ

ارتعاش نور کا نظّارہ دلکش ہے مگر
گردش عالم میں اُسکی لغزش مستانہ دیکھ

دیکھ کیا نواب کہتا ہے وگرنہ یاد رکھ
خود نتیجہ دیکھ لیگا ایک دن تو۔ جا۔ نہ دیکھ

جلوۂ یقین

(۳۱- جنوری سنہ ۱۹۲۰ء)

گم گشتگانِ شوق کا خود رہنما ہے تو　　لب تشنگانِ ذوق کا آبِ بقا ہے تو

جب ٹوٹتی ہے کشتیِ دل غم کے بحر میں　　جھکتے ہیں تیرے سمت کہ اب ناخدا ہے تو

جب سب طرف سے ٹوٹتی ہے آدمی کی آس　　بول اُٹھتا دل ہے تب کہ مرا آسرا ہی تو

سائنس حق تو یہ ہے کہ وہ دوربین ہے　　آتا نظر ہے جس میں کہ بیشک خدا ہے تو

درد اپنا کس سے اور کس اُمید پر کہیں　　تو نے دیا ہے درد اور اُسکی دوا ہے تو

ہے کسقدر خیال تجھے کُھل گیا ہمیں　　ادنیٰ سے لغزشوں پہ بھی ہمسے خفا ہی تو

اتنا قریب ہے کہ رگِ جاں بھی دُور ہے　　کہتا ہے کون تجھکو کہ ہمسے جدا ہے تو

نواب کیسا شور مچا ہے زمانے میں
اللہ کا ہے شکر کہ حق کی صدا ہے تو

تلاشِ حق

(۲۱ - فروری ۱۹۲۱ء)

ہر اک کہتا ہے دُنیا میں کہ حق میرا ہی مذہب ہے
حقیقت ایک ہے لیکن سمجھ کا پھیر یہ سب ہے

ہمیں سائنس نے دِکھلا دیا پانی مُرکّب ہے
مگر دیکھیں کہاں تک تشنگی سے خشک یاں لب ہے

بلند آہنگ دعوٰی ہے ترا اے فلسفی بیشک
مگر دل کو تری تقریر سے تسکین ہو جب ہے

قوانین کشش کی بحث ہم محشر میں بھی کرتے
مگر کمبخت دل مُجرم ہے اقبالی یہ بیڈھب ہے

پھنسا ہے کسلئے ذرّات کے چکّر میں تو ناداں
بنائے جس نے کل پُرزے ہیں عالم کے وہی رب ہے

غمِ دنیا نہ فکرِ آخرت سے کچھ غرض اس کو
تجھی سے کام ہے عاشق کو تیرے تجھسے مطلب ہے

جو دنیا سے گیا۔ قائم قیامت ہو گئی اُس کی
عبث نوّاب سے ہو پوچھتے محشر کا دن کب ہے

ایقانِ آخرت

(۲۳ - ستمبر ۱۹۱۲ء)

دل میں جنکے معرفت کا نور پیدا ہو گیا
اُنپہ رازِ زندگی در پردہ افشا ہو گیا

واہ کیا خواب عناصر کی ہے تعبیر آدمی
جسکے دم سے دہرِ تیرہ میں اُجالا ہو گیا

روح جو سوتی تھی عمر بھر وہ یوں جاگی ہے اب
جس نے دیکھا اک نظر محوِ تماشا ہو گیا

سچ ہے خوابِ زندگی خوابِ عناصر کی طرح
ہاں مگر تعبیر دینے والا عنقا ہو گیا

مادّیت کی ہے ظلمت چار سو چھائی ہوئی
چشمۂ خورشید ایماں آہ گدلا ہو گیا

ہمنے مانا مادہ فانی نہیں لیکن یہ کیا
بعد مرنے کے ہمارا پاک قصّہ ہو گیا

جسم کے ذرات تو باقی رہیں ہم مر مٹیں
موت کیا آئی ہمیں خونِ تمنّا ہو گیا

موت کیا ہے۔ ارتقا کے سلسلے کی اک کڑی
مرکے اس منزل میں جینے کا سہارا ہو گیا

زندگی کیا ہے فقط اک نردبانِ روح ہے
صورتِ نشو و نشر سے آشکارا ہو گیا

خاک کے پتلے فنا ہونا ترا اب ہے محال
دعوی قانونِ ہستی تجھ پہ اجرا ہو گیا

ہم یہاں ہوں یا وہاں تو اب مٹ سکتے نہیں
امرِ ربّی کے اشارے سے ہویدا ہو گیا

وعدۂ دیدار

(۵ - جون سنہ ۱۹۳۰ء)

حسنِ ازل کا مہر بھی کیا تابدار ہے — عالم کا ذرّہ ذرّہ دلِ بیقرار ہے

اصل اک سراب ہستی ناپائدار ہے — اسکی نگاہ لطف کی ساری بہار ہے

دہری اگر نہیں ہے مصور تو کس لئے — حیرت فزائے دیدہ یہ نقش و نگار ہے

یہ زندگی ہے یا کہ ہے رقصِ شرر یہاں — یہ موت ہے کہ مژدۂ فصلِ بہار ہے

آئے یہاں کہ لائی کسی کی تلاش کھینچ — جاتے ہیں اب کہ وعدۂ دیدارِ یار ہے

دردِ طلب گواہ ہے ساقی کے لطف کا — باقی مئے الست کا اب تک خمار ہے

مانا کہ اپنے فعل کا مختار ہے بشر — دل اسکو ہم نہ دیں یہ نہیں اختیار ہے

جو دم گذر رہا ہے غنیمت سمجھ اسے — دم آئے یا نہ آئے کسے اعتبار ہے

ہے کشمکش حیات کی بیشک عذابِ جان
نوآب کو خبر نہیں وہ محوِ یار ہے

بہارِ عمل

(۱۷۔جون ۱۹۲۰ء)

عزیز کیوں نہو دُنیا کہ ہے یہ دارِ عمل
مٹیں نہ زیست پہ کیونکر کہ ہے نگارِ عمل
پسینہ محنتِ دل کا ہے شکل حور و قصور
بہشت غور سے دیکھو تو ہے بہارِ عمل
ہے کارگاہ یہ دُنیا لباسِ تقویٰ کی
نہیں ہے کھیل تماشا یہ پود و تارِ عمل
دلا حیات کا مردانہ مارلے میدان
کہ بعد موت کے ہے ختم کارزارِ عمل
نہیں ہے سبزۂ خودرو یہ جدّ و جہدِ حیات
ہے دل کے خون سے سرسبز کوہسارِ عمل
عمل کا بوجھ جو ثواب تو اُٹھاتا ہے
نہ بھول اُسکو کہ نیّت پہ ہے مدارِ عمل
الٰہی فضل کی گنتی میں تیرہی گنتا ہوں
فرشتے لکھتے ہیں جاتے اگر شمارِ عمل

آہنگِ عمل

(۲۲- جنوری ۱۹۲۰ء)

دُنیا کے جھگڑے جتنے ہیں اک سمت وھرنا چاہیئے
مرنے سے پہلے عشق میں جاناں کے مرنا چاہیئے

کیا ہے" کہا سائنس نے "کیوں ہے" یہ بولا فلسفہ
کہتا ہے مذہب "جو بھی ہو- کچھ ہمکو کرنا چاہیئے

عالم کا شیرازہ نظر جبدن سے آیا عقل کو
ترکیب خود بولی اسے اکدن بکھرنا چاہیئے

گر گوہرِ جاں کو بہا موجِ فنا لیجائے گی
کہتا ہے غوّاصِ بقا- اُسکو اُبھرنا چاہیئے

یہ منتظم عالم ہے کب ایدل گھروندا کھیل کا
یہ ہے عمل کا دائرہ کچھ کر کے مرنا چاہیئے

جل کر برنگِ شمع تو پھیلا جہاں میں روشنی
رقص شرر ہے زندگی کیوں آہ بھرنا چاہیئے

مقدور بھر جب کر چلے جو کچھ کہا حق نے تو پھر
امید رکھنا چاہیئے تو اب ڈرنا چاہیئے

انقلاب دہر

(۲۰ - جنوری سنہ ۱۹۱۹ء)

زمانہ کہہ رہا ہے ساری قومیں اب برابر ہوں
یہ ہے فرمان آزادی کہ اپنی آپ رہبر ہوں

ترقی کا کھلا ہے راستہ غل چار جانب ہے
پرانی اور نئی دنیا میں سب ہم رنگ و ہمسر ہوں

یہ ہے لیل و نہار دہر کا فتوائے حریت
کریں جو فرق کالے اور گورے میں وہ کافر ہوں

یہی کچھ مصلحت ہے اُس خدائے پاک و اعلیٰ کی
نیا نقشہ ہو عالم کا نئے حاکم مقرر ہوں

عجب کیا ہے پڑے ہیں خاک پر جو صورتِ ذرہ
ترقی کی فلک پر وہ چمک کر ماہ و اختر ہوں

مسلمانو ذرا سوچو تو ہم کس بات میں کم ہیں
وہ ہیں اوصاف کیا جن سے کہ ہم ان سب سے بہتر ہوں

کمی ہے عزم و استقلال کی اخلاص و تقویٰ کی
خداوندا مسلمانوں میں پھر پیدا یہ جوہر ہوں

وہ دل نواب پیدا ہوں کہ جن میں دردِ ملت ہو
ابھر سکتے نہیں ہم لاکھ اگر اب لاٹ ہوں سر ہوں

زندانِ بلا

(۲۷ - جنوری ۱۹۱۹ء)

کون ہے یاں کہ جو با نالہ و فریاد نہیں — ہے عجب دیرِ کہن جس میں کوئی شاد نہیں

مدعی سب ہیں مگر کوئی بھی مجنوں نکلا — آج تک نجد بیاباں ترا آباد نہیں

بے ستوں لاکھوں ہیں شیریں بھی ہزاروں ہیں یہاں — سب ہیں القصہ مگر ایک بھی فرہاد نہیں

خیر یوں ہی سہی بلبل ہے قفس میں گر بند — نالہ پابندِ اسیری کبھی صیاد نہیں

کشورِ حسن نہ جمہوریہ ہو جائے کہیں — تو جو عشاق کی سنتا کبھی فریاد نہیں

غل ہے دنیا میں نہ اب ہوگی کبھی جنگ و جدال — چپ ہیں عشاق کہ راضی ستم ایجاد نہیں

کہیں فطرت بھی بدل جاتی ہے توبہ کیجے — وہی خنجر نہیں کیا - کیا وہی جلاد نہیں

چرخ کے جور سے **نواب** نہ تڑپیں کیوں کر
دل ہے کنکر نہیں پتھر نہیں فولاد نہیں

کشمکش

(۲۶ - دسمبر ۱۹۱۹ء)

نالہ کروں تو صبر و سکوں کے خلاف ہو
گر چپ رہوں تو جوش جنوں کے خلاف ہو

آنکھوں کو چپکے چپکے یہ سمجھا رہا ہوں میں
ایسا نہ ہو کہ رازِ دروں کے خلاف ہو

میں اور اپنی وضع بدل دوں نہ ہو گا یہ
گو رنگ دہرِ بوقلموں کے خلاف ہو

افسونِ عشق و سحرِ نظر مانتا ہوں میں
سائنس گرچہ سحر و فسوں کے خلاف ہو

قاتل نہ شرمسار ہو نواب حشر میں
کہنا وہی جو دعویِٔ خوں کے خلاف ہو

نشترِ غم

(۷- فروری سنہ ۱۹۲۰ء)

خوشی سے پھولتا ہے کوئی ۔ گھلتا ہے کوئی غم سے
ترا دیوانہ رہتا ہے الگ دونوں کے عالم سے
ہوائے شوق چلتی ہے دھواں آہونکا اُٹھتا ہے
ہوئے ٹھنڈے کلیجے عاشقوں کے چشم پُرنم سے
ترے شیدائیوں کو یاد میں تیری کہاں فرصت
نہ شادی سے ہے کچھ مطلب غرض ہے کچھ نہ ماتم سے
تِلی پشت حکومت پہ فنا کی خاک تیرہ ہے
ہوا یہ راز ہم پر آئنہ - آئینۂ جم سے
نہیں آنکھوں میں یہ آنسو بھرے ہیں یاد میں تیری
لب ساحل اُبھر آئے ہیں موتی جوششِ یم سے
غم و شادی میں صبر و شکر کا جلوہ نظر آیا
تعلّق نور کا اُن کے ہے صاحبدل کے عالم سے

ملا غم اُس کا دنیا میں ۔ بڑی نعمت ملی ھم کو
نتیجہ خوب نکلا قصۂ ابلیس و آدمؑ سے
غم اُس کا زخم دل کے واسطے نواب حکمت ہے
دیا نشتر ہے پہلے ۔ کام وہ پھر لیگا مرہم سے

(قطعہ)

ہیں عاجز دونوں کُنہ ذات کی تحقیق سے لیکن
جدا ہے کائنات فلسفہ مذہب کے عالم سے
زمیں و آسماں کا فرق دیکھو صاف ظاہر ہے
نہیں نسبت ہے "لا اعلم" کو کچھ "واللہ اعلم" سے

دیگر

کتاب دہر کا ہر حرف اک دفتر ہے عرفاں کا
مگر فرصت کہاں رہ و ترکے بر قیات عالم سے
زمیں و آسماں کے یوں تو قُلّا بے ملا دیں گے
رہ حق میں مگر یہ چلتے پُرزے گر پڑے دھم سے

دردِ ملّت

(۱۵- مارچ ۱۹۲۰ء)

تڑپ جاتے ہیں ہم دُنیا میں ہر سو دردِ ملّت سے
بھرا ہے شیشۂ دل اپنا خونابِ محبّت سے
یہ طبع گرم ہے اپنی فقط دینی حمیّت سے
تمھیں اندازہ اِس کا ہوگا مقیاس الحرارت سے
یہ جذبہ وہ ہے جو ہر کلمہ گو کے دل میں پنہاں ہے
یہ جذبہ وہ ہے جو پیدا ہوا عہدِ نبوّت سے
یہ جذبہ وہ ہے جس نے رنگ کی تفریق کو کھویا
یہ جذبہ وہ ہے جو ظاہر ہوا کثرت میں وحدت سے
یہ جذبہ وہ ہے جو ہے خونِ صالح قلبِ مومن میں
یہ جذبہ نہر ہے نکلی ہے جو دریائے رحمت سے
یہ جذبہ ہے کہ ہے کانِ نمک جس میں ہیں سب یکساں
یہ جذبہ شمع ہے روشن ہے جو نورِ محبّت سے

یہ نسلی امتیازوں کے لئے اک برق خاطف ہے
یہ ٹھکرا دیتا ہے قومی تفاخر کو حقارت سے

خبر یورپ نہیں اب تک ہے تیرے ہوشیاروں کو
یہ کیا شئے ہے کہ ہیں ہم مست جس کی کیف ولذت سے

بھڑکنے کو ہے پھر یہ آتش بے دود عالم میں
مٹانے کو ہے پھر جادوے دنیا یہ کرامت سے

یہ مانا ہم ہیں اب بیدست و پا بے یار و بے یاور
مگر اللہ کر سکتا ہے سب کچھ اپنی قدرت سے

یہ مانا اب بہتر کیا ہزاروں ہوگئے فرقے
مگر بیتاب سب آتے نظر ہیں درد ملت سے

ہمیں یہ مغربی تہذیب دھوکا دے نہیں سکتی
کہ مسلم دیکھتا دنیا کو ہے نورِ فراست سے

یہ ہے وہ مادہ سیّال جو ہے منجمد بھی ہے
تعصّب کی حرارت۔ سرد مہری کی برودت سے

وہ طیّارہ ہے بے پر کی اڑاتا واقعی جو ہے
وہ سیّارہ ہے جو ہے ملتہب خود اپنی فطرت سے

قرونِ مظلمہ میں ہمنے یورپ کو کیا روشن
نکالا اس کو جہل و وہم کے قعرِ مذلّت سے
ہم ہی تھے نسل اسرائیل کے کہف اماں۔ جسدم
نکالی جاتی تھی وہ "آسمانی بادشاہت" سے
بنایا اندلس کو ہمنے تیری صورتِ جنت
مگر تونے نکالا ہمکو واں سے کس قساوت سے
بچایا ہمنے مشرق کا کلیسا دستِ پاپا سے
مگر مجرم ہم ہی ٹھہرے ہیں مغرب کی عدالت سے
گیا عباسیوں کا دور جب تب آلِ عثمان نے
اُٹھایا دینِ برحق کا علم جوشِ شجاعت سے
وہ تھے شاخِ طلا پر مثل اک دیوارِ آہن کے
پلٹ جاتے تھے سر ٹکرا کے دشمن اپنا ذلّت سے
خدا کی شان ہے وہ دم بخود اب آج بیٹھے ہیں
کبھی دم مار سکتا تھا نہ یورپ جن کی ہیبت سے
ہمارے ذمّیوں کے ساتھ احسان یاد کر یورپ
نہیں گر یاد ہیں تو پوچھ لے اِن خود بدولت سے

ہمارے زیر سایہ غیر بھی پھولے پھلے ایسے
کہ اب ہمکو جگہ ملتی نہیں ہے اُنکی کثرت سے
نکلتے ہیں فقط تصویر کے پردے میں ہم ظالم
نئی دنیا کی جدت اور پرانی کی شرارت سے
معاذ اللہ۔ گر غیروں کو ہم پامال کر دیتے
تو خارج ہم کبھی ہوتے نہ بلقاں کی حکومت سے

مطلع ثانی

ٹھہرا ے خامہ کیا لکھتا ہے تو جوشِ طبیعت سے
سنبھل اے دل تڑپتا کسلئے ہے دردِ ملّت سے
جو مسلم ہیں بنا ہے چار گوہر سے خمیر اُن کا
شرافت سے شجاعت سے محبت سے عبادت سے

جو مسلم ہیں وہ ہیں خیر الامم دنیا کے ہر فن میں
کہ مثلِ آئینہ سینہ ہے صاف انکا کدورت سے
خدا کے واسطے لڑنا خدا کے واسطے ملنا
خدا کی راہ میں چلنا خلوص و استقامت سے

جو مسلم ہیں غضب میں وہ کبھی حد سے نہیں بڑھتے
جو مسلم ہیں نہیں وہ مسخ ہوتے مادّیت سے
جو مسلم ہیں تواضع میں نہیں ان کا کوئی ثانی
مجسم قہر حق لیکن ہیں وہ تو ہیں ملت سے
جو مسلم ہیں وہ شور و شر سے کوسوں دور رہتے ہیں
وہ جو کچھ کرتے ہیں کرتے ہیں اُسکو آدمیّت سے
جو مسلم ہیں وہ اپنے قول کے پابند ہوتے ہیں
ہمیشہ دیکھتے ہیں بالیسی کو سخت نفرت سے
جو مسلم ہیں نہیں وہ دورخی باتیں کبھی کرتے
وہ جس سے ملتے ہیں ملتے ہیں اُس سے صاف طینت سے
وہ دشمن پر بھی کرتے رحم ہیں قدرت جو پاتے ہیں
زمانہ مثل آئینہ اُنھیں تکتا ہے حیرت سے
ہے انکا ظاہر و باطن درخشاں مثل ہیرے کے
نہیں واقف مگر یورپ ابھی تک انکی قیمت سے
لقب ہے رحمۃ للعالمین کونین میں جس کا
سراپا حلم ہیں ہم رحم ہیں۔ اُس کی عنایت سے

دیا ہے ہم کو اک مصباح دین اللہ نے ایسا
کہ رکھا ہے جسے دنیا میں خود اُس نے حفاظت سے
وہ نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ حَقًّا عَلَيْنَا[1] صاف کہتا ہے
توی دل کیوں نہوں دنیا میں ہم ایسی بشارت سے
کسی شے سے ترے ڈرتے نہیں اے عالم فانی
خدا کا خوف ہے اُمید ہے بس اُسکی رحمت سے
ہماری زندگی اور موت سب ہے ہاتھ میں اُس کے
بنا ہے یہ طلسمی کارخانہ جس کی قدرت سے
ہم آئے ہیں جہاں میں نام پہ اُس کے فقط مرنے
نہیں واقف کوئی دنیا میں اس مرنے کی لذّت سے

مطلع ثالث

ہوئے ہم جب سے غافل آہ قرآں کی ہدایت سے
بہت رسوا ہوئے ہیں اپنے اعمالوں کی شامت سے
جو کچھ کھویا ہے ہمنے آپ ہی آپس میں لڑ لڑ کر
اٹھائیں کیا مسلمان سر کو اپنے اب خجالت سے

---

[1] سورہ یونس

مسلمان جب لڑے آپس میں سیلاب تتارؔ آیا
اُٹھایا یہ فتنہ بھی آپس کے طوفان عداوت سے
علم توحید کا تاتار نے پھر خود اُٹھایا تھا
مگر اک ایک کا منہ تک رہے ہیں آج حسرت سے
عجم دم توڑتا ہے اور عرب میں خاک اُڑتی ہے
زمانہ دیکھتا ہے ہم کو اے وا چشم عبرت سے
مدد غیروں سے اب ہم مانگتے ہیں وائے ناکامی
زمیں میں خسف ہو جانا ہے بہتر ایسی حالت سے
خداوندا بچالے تو ہمیں اس سخت آفت سے
نہیں ہیں نا اُمید اے رب اعلیٰ تیری رحمت سے
جہاں سب ملک تیرا ہے جسے تو چاہے دیتا ہے
خداوندا اگر رکھنا ہمیں دنیا میں عزّت سے
پھریں دنیا میں کیا مغضوبؔ کی مانند اب ہم بھی
الٰہی اس سے بہتر ہے کہ ہم مرجائیں عزت سے
یہ مانا ہم بڑے عاصی ہیں لیکن پھر بھی تیرے ہیں
بچالے ہم کو ہمچشموں میں ایسی سخت ذلت سے

الٰہی ہم علمبردار ہیں توحید کے تیرے
الٰہی ہم ہیں منظورِ نظر عہدِ رسالت سے
جہاں نے تو ہمارا فیصلہ ہی کر دیا لیکن
خداوندا ہمیں اُمید ہے تیری عدالت سے
الٰہی زندگی نواب کی ہے تلخ دنیا میں
وہاں دِل کو شیریں کردے ایماں کی حلاوت سے

فتنۂ دوراں

(۱۴- مارچ ۱۹۳۰ء)

دُہرایا آسمان نے سبق گیرودار کا
پیشِ نظر ہے پھر وہی فتنہ تتار کا
چھایا خزاں کا رنگ ہے اسلامیوں پہ
گذرا زمانہ "شاخِ طلا" کی بہار کا
خشکی میں بھی جنھوں نے چلایا جہاز کو
ڈوبا سفینہ آہ اب اُنکے وقار کا
واحسرتا کہ خونِ شجاعت کا ہوگیا
سرمایہ لُٹ گیا شرف و افتخار کا
حامی دین جو تھے وہ ملے آہ خاک میں
حافظ خدا ہے دین کے اب اقتدار کا

دکھڑا اندرو ئیں آؤ غم روزگار کا
چھوڑیں کبھی تذکرہ فلک کجمدار کا

سیل تتار سے گذر کر نکل گئے
ہوگا بخیر خاتمہ اس خلفشار کا

بلقان لیا نکل گئے جب اندلس سے ہم
بلقان کو کھو کے پا مُنگیے اب ملک زار کا

توحید کا علم نہ کبھی ہو گا سرنگوں
شاہد کلام پاک ہے پروردگار کا

پیمانۂ فلک کو ہے گردش زمانے میں
ساقی کو ہے خیال ہمارے خمار کا

ہنگامۂ جہاں میں ہے نواب ہر نفس
اُمیدوار رحمت پروردگار کا

لہ هوالذی ارسل رسوله بالهدیٰ و دین الحق لیظهره
علی الدین کله ولوکره المشرکون (سورة صف)

آشوبِ عالم

(۱۵- ستمبر سنہ ۱۹۲۰ء)

آسمان ہے اگرچہ حدِ نظر / جور کی حد نظر نہ آئی مگر

بس بس اے عہدِ سفلہ دوں پرور / کھل گئے ہم پہ عیب تیرے جو ہر

شیشۂ دل کو تو نے توڑا ہے / ہمکو پینا پڑا ہے خون جگر

آبِ آتش یہ کیا کیا تو نے / رگِ جاں میں چبھو دیا نشتر

خوب کی تیز شوقِ صلح کی آگ / ہو گیا امن عام خاکستر

راگ گایا خود اختیاری کا / سر و پا کی رہی نہ کچھ بھی خبر

واہ وا اے ہوائے آزادی / خوب دیکھا تماشا پھونک کے گھر

اک نہ اک شکل میں ہے جور عیاں / تیغ ٹوٹی تو بن گئے خنجر

دیدۂ دل کو اب نظر آیا / مادّیت ہے اصل فتنہ و شر

ایسی تہذیب سے ہو کب اصلاح / نہیں تقویٰ کا جب کہ دل میں اثر

اُسکی تعلیم پیشِ خیمۂ جنگ / اُسکی تاسیس امنِ عام کا گھر

خوف اُسکا نفاق کا روزن / خطر اسکا خلوص کا منظر

ظلمتِ جہل میں وہ جگنو ہے — ریڈیم ہے یہ علم کا جوہر
جسم لائن ہے اُسکے انجن کا — اِسکے طیّارے اُڑتے ہیں ان پر
تیغ نے اُسکی جسم کو کاٹا — اِسکی بجلی ہے قلب کے اندر
ارتقا اُسکا ہو گیا پورا — پشت کے سمت کچھ مگر ہے کسر
اِسکی معراجِ اصطفٰے سمجھو — خاک پر گرچہ سجدے میں ہے سر
حیف شیدا ہے اُسکی اک دنیا — اِسکا عاشق جہاں میں ہے کمتر
اتقوا اللہ یا اولی الالباب — نوحہ گر کیوں ہو ملک وملت پر
کیسے جلسے کہاں کی تقریریں — پھرتے کیوں دربدر ہو خاک بسر
نہیں قدرت کسی میں ہے کچھ بھی — ہیں اُسی کی طرف سے نفع وضرر
یہ ابوالہول[1] ہیں سیاست کے — جنکو سمجھے ہوئے ہو تم لیڈر
یہ جراثیم پالسی کے ہیں — خادمِ دیں نہیں - ہیں بندۂ زر
ہیں یہ نقّال مغربی تہذیب — ملک وملّت کے ہیں یہ بازیگر
نام ہو اُن کا کام ہو کہ نہو — راہ بھولے ہوئے ہیں خود رہبر

۱؎ مصر کے مشہور اہرام میں ایک عظیم الجثہ سنگی بت کا نام ہے جس کا طول ۱۴۰ فٹ ہے اور سر ۳۰ فٹ

فائدے سے انھیں غرض ہر دم
عقل کو سمجھے ہوئے ہیں پیغمبر

کام میٹھی چھری سے لیتے ہیں
زہر دیتے ہیں ہو کے شیر و شکر

دین کشتی کی آڑ ہے ان کا
کھیلتے ہیں شکار شام و سحر

حال خود ان کا ہو گیا دشمن
بس شکایت کا بند کر دفتر

سطح ثانی

آگیا آفتاب اب سر پہ
کام کا وقت ہے اُٹھا بستر

یہ ہے وہ دور دل سے فتویٰ پوچھ
مان حکم خدا و پیغمبر

تجھکو کافی ہے بس کتاب اللہ
کیا غرض ہوں جو زید و عمرو و بکر

حسبنا اللہ پہ رہے ایمان
وہی مولیٰ ہے - ہے وہی داور

مانگ اُس سے جو ہے کریم و رحیم
ہے جو تسکین دہ دل مضطر

توڑتا ہے جو زعم استبداد
لیتا مظلوموں کی وہی ہے خبر

سر قیصر سے تاج چھین لیا
زار کے جسم سے اُتارا سر

اک اشارے میں اسکے ہوں نابود
سطح غبرا و گنبد اخضر

کیا ہیں سائنس کی یہ ایجادیں
نکل آئے مگر ہیں مور کے پر

فلسفہ کی بلند آہنگی
ڈھول میں پول ہے تامل کر

کٹ مرے دام و دد کی صورت میں ... دیکھ تعلیم ڈارون کا اثر

اب کہاں دل کی ہے وہ جمعیت ... رنگ لایا اصول اسپنسر

دورِ تہذیب کے ہیں یہ عنواں ... مکر و زور و فساد و فتنہ و شر

وہ اٹھا پردہ دیکھ لے اب تو ... دیدۂ دل پہ تھا فریبِ نظر

غور سے سن الا بذکر اللہ ... پھر تجسّس نہ کے پی ساغر

یاد میں اسکے بھول جا تو اب ... زن و فرزند و جاہ و مال و زر

اسکا ہو جا تو پھر ہیں سب تیرے
مہر و اختر فرشتہ جن و بشر

تماشائے صلح

(۱۰ ستمبر سنہ ۱۹۲۶ء)

دیر کہن میں دور ہے عہد جدید کا
قوموں میں شور مچ گیا ہَلْ مِنْ مَّزِیْد کا
تاکید ہے کہ سوٹ ہو طیار صلح کا
یعنی یہی تو وقت ہے قطع و برید کا
دکھلایا وہر نے ہے عجب سبز باغ ایک
بو مکر کی اگر ہے تو ہے رنگ کید کا
مطلب سے اپنے کام ہے نکلے بھی جسطرح
وعدے کا پھر خیال نہ ڈر ہے وعید کا
ذوق شہود کا نہیں اب کوئی مشتری
بازار ایک گرم ہے گفت و شنید کا
آب حیات کے لئے کھوتے ہیں آبرو
سمجھے نہ خاک مرتبہ اب تک شہید کا
ڈوبا جدھر ہے قوم کا خورشید اقتدار
نواب اُدھر ہی دیکھ وہ ہے چاند عید کا

مرقع عبرت

(۱۵ - مئی ۱۹۳۰ء)

بچھا ہے پالسی کا ریشمی اک دام دُنیا میں
نوا سنجوں کا کیا ہو دیکھئے انجام دنیا میں
ہوا ہے شوق اب مریخ سے پیغام بازی کا
قیامت ڈھائیں گی یہ مغربی اقوام دنیا میں
نظر آتا نہیں ہے خواب میں بھی اہلِ عالم کو
بندھا ہے شہپرِ عنقا سے کیا آرام دنیا میں
وہ تسکینِ دلِ اندوہگیں ثابت ہوا الحد
جسے سمجھا ہے تو مجموعۂ اوہام دنیا میں
وبا تشکیک کی عام اور پھر قحط الرجال ایسا
کتابوں ہی میں رہجائیگا حق کا نام دنیا میں
اگر دل ہے تو خود ہی بول اُٹھیگا ایکدن تیرا
نہیں کچھ بحث تجھ سے منکرِ الہام دنیا میں

جو ہیں تہذیب کے شیدا اُتاریں سُوٹ وہ۔ توبہ
ترا دیوانہ ہی باندھیگا بس احرام دنیا میں
نئی تہذیب نے جھونکی بہت کچھ خاک آنکھوں میں
دکھاوے اسکا خیر الماکرین انجام دنیا میں
غزل کیسی یہ مثل شیشہ خون نواب روتا ہے
کبھی ہم بھی تھے خنداں آہ شکل جام دنیا میں

رباعی

مٹائیگا ہمیں کیا چرخ نیلی فام دنیا میں
کوئی ہے۔ ہم سے لے توحید کا یہ جام دنیا میں
مسلمان صورت غوّاص غوطے کھا کے اُبھرینگے
برنگ برق اُٹھیگا گر کے پھر اسلام دنیا میں

تلخیِ ایّام

(۹-جون ۱۹۳۰ء)

کہہ رہی ہے صاف گردش چرخِ نیلی فام کی
آدمی کی طرح ہے موت وحیات اقوام کی
ایک ہی قانون ہے کون و فساد دہر کا
ایک ہی تاریخ ہے نیرنگیِ ایّام کی
مشرق ومغرب میں کپلنگ[1] اک ہے فرق ظاہری
ورنہ حالت منقلب یکساں ہے صبح وشام کی
وہ عقاب تیز پرِ روما کا جیسے اُڑ گیا
مٹ گئی ویسے ہی بزم آرائی جم کے جام کی
چند آتش بازی کی ہیں چرخیاں چھٹتی ہیں جو
یہ حقیقت ہے فقط اس گیر ودار عام کی

---

[1] زمانۂ حال کے انگریزی شاعر کا نام ہے جس کا ایک مشہور شعر ہے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب ہے اور یہ دونوں کبھی مل نہیں سکتے ۱۲

نازِ معشوقانہ پر قاتل کے بھولے ہیں رقیب
رنگ لانے کو ہے بارش تیغ خوں آشام کی

منظرِ گرگ آشتی پیش نظر ہے چار سو
یعنی قلعی کھل گئی تہذیب کے پیغام کی

چرخ کا شکوہ نہیں - ہاں تجھ سے کہنا ہے تو یہ
بارِ شیریں تھیں ساقیا ہم پر ترے انعام کی

فتنۂ تا تار کے شر میں تھا مضمر ایک خیر
شہد ہو جائے یہ تلخی دور نافرجام کی

ہم اگر نوابؔ خاکستر بھی ہو جائیں تو خیر
دھوم عالم میں ہو یارب دعوتِ اسلام کی

(قطعہ)

خوانِ ہستی اور چُنے بخت اتفاق اسکو - جو خوش
ہیں یہ بزم آرائیاں اس کے صلائے عام کی

ارتقائی سانپ لگا یا ہے بتہ آغاز کا
کاش ہو جاتی کچھ اُس کو بھی خبر انجام کی

گلبانگِ رجا

(۱۷ - جولائی ۱۹۲۰ء)

صبح کی طرح اگر چاک گریباں ہوں میں
کیا ہوا - قاصد خورشید درخشاں ہوں میں

دل تو ظلمتکدۂ دہر میں روشن ہے مرا
شمع کی طرح اگر دوستو گریاں ہوں میں

ایک طوفانِ حوادث ہے اُٹھا عالم میں
اِس تلاطم میں مثالِ دُرِ عُماں ہوں میں

عہدِ اُلفت ہے کہ وہ تسن کی ہیں جو دہ شرطیں
مثلِ آئینہ تری بزم میں حیراں ہوں میں

نام بدنام نہ ساقی ترا ہو جائے کہیں
یہ چِلّا ورنہ - کہ اس بزم میں مہماں ہوں میں

ساقیا توڑ نہ پیمانۂ دل کو میرے
کہ تری اُلفت دیرینہ کا پیماں ہوں میں

قطرۂ آبِ حیات اور پھر اس ظلمت میں
کشمکش زیست کی ہے اور مسلماں ہوں میں

دردِ الفت بھی گیا لذّت ادراک کے ساتھ
ڈارون جب سے یہ کہتا ہے کہ حیواں ہوں میں

دل لیا جس نے اُسے جانتا پہچانتا ہوں
فلسفی خیر سمجھے یوں ہی ناداں ہوں میں

خود ہی وہ قحطِ وفا میں مرے پاس آئیں گے
شکوہ اخواں کا نہیں یوسفِ کنعاں ہوں میں

یوں ہے گویا دلِ نواب کہ اُلفت تیری
مجھ میں محفوظ ہے اس طرح کہ قرآں ہوں میں

سبیل نجات

(۲۳ - مئی سنہ ۱۹۳۰ء)

جہان میں دعوی آزادگی ہے سب بے بنیاد
خدا بھی کب ہے وجوب وجود سے آزاد
وہ ہے - جبھی تو ہے انکار تجھکو اے ملحد
نہ جو - اُس سے نہ کچھ بحث ہے نہ استشہاد
ضرور دائرۂ دہر کا ہے اک مرکز
کشش یہ کہتی ہے لاریب ہے کوئی اُستاد
ہے آستین عناصر میں ایک ہاتھ ضرور
وگرنہ کیسے یہ اشکال اور یہ ابعاد
برنگ بادۂ گلگوں فلک کے شیشے سے
جھلک رہی ہے کسی کی صفائی ایجاد
وجود حق - عمل صالح ویقین معاد
انھیں پہ دینؔ کی قائم ہے اصل میں بنیاد

ؔ حق تعالے ارشاد فرماتا ہے ان الذین آمنوا والذین ھادوا والنصٰری والصابئین من آمن باللہ والیوم الاخر وعمل صالح فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (سورہ بقر)

نجات کے یہ اقانیم ہیں سُن اے گمراہ
خُدا کا خوف اُمید اُس سے اور اُسکی یاد
موحد اور اُسے خوف ماسوا - توبہ
وہ اُسکی راہ میں چلتا ہے ہرچہ بادا باد
نہ غم کا غم نہ خوشی کی خوشی موحد کو
وہ اُسکی یاد میں بغم وہ اُسکے ذکر میں شاد
کسی میں کب ہے یہ قدرت جو کرسکے کچھ بھی
سوا ترے نہ کسی سے کرینگے ہم فریاد
بنائیں دست حوادث ہمیں گل بازی
وہ سرو ہم ہیں جو ہیں باغ دہر مین آزاد
ہم عندلیب ہیں توحید کے گلستاں کے
یہ زمزمے ہیں جسے غیر سمجھے ہیں فریاد
زمانہ قرب قیامت کا ہے یہ سُن نواب
جہاں میں گرم ہے بازار مکر و کید و فساد
اگر فلاح کا طالب ہے تو تو رکھ ہردم
خدا سے کام کسی سے نہ دوستی نہ عناد

راہ صواب

(۱۰- جنوری ۱۹۳۱ء)

کہتی ہے عقل ترک سوالات چاہیئے
دل چاہتا ہے یہ تجھے دن رات چاہیئے

عہدے نہ چاہیئے نہ خطابات چاہیئے
دنیا ہمیں تری نہ خرافات چاہیئے

روٹر کی تار برقیاں رہنے بھی دیجیئے
ہم کو تو عاشقوں کے حکایات چاہیئے

یورپ کو جاتے تیرے بطحا بھی چھٹتے ہیں
کچھ تو خیال حج و زیارات چاہیئے

حکمت مآب بن کے بھی گم کردہ راہ ہیں
قرآن پاک کے ہمیں آیات چاہیئے

ایمان و کفر شیر و شکر ہو رہے ہیں اب
پیروں کی دیکھنا یہ کرامات چاہیئے

توحید و شرک جمع نہ ہونگے کبھی - مگر
ہمسائگی میں حسن مراعات چاہیئے

دین متین ہے شائبۂ پالسی سے پاک
صدق و صفا کے ہم میں کمالات چاہیئے

یہ چاہیئے ہمیں نہیں وہ چاہیئے جو خوش
جس میں رضائے دوست ہو وہ بات چاہیئے

ہم منتظر ہیں ساقی کوثر کے لطف کے
ہم کو نہ کچھ بھی قبلۂ حاجات چاہیئے

نواب دن کو مشغلہ ذکر یار ہو
شب کو قیام صبح مناجات چاہیئے

شیوۂ تسلیم

(۸ - دسمبر ۱۹۱۹ء)

انقلابِ دہر سے اے دل پریشاں کس لئے
دیدۂ بینا ملے ہیں تجھکو حیراں کس لئے
اسکی ہستی کیا ہے اک گل ہے فقط چلتی ہوئی
موردِ الزام ہو گردونِ گرداں کس لئے
خود اُلٹتے کب ہیں تاریخ زمانہ کے ورق
شکوۂ بیداد و بدعہدیٔ دوراں کس لئے
دستِ قدرت میں زمامِ قسمتِ اقوام ہے
گرم و سردِ دہر سے ترساں و لرزاں کس لئے
حکمرانی میں بھی رنگ مدّ و جزر بحر ہے
دیدۂ حق بیں میں اشکوں کا یہ طوفاں کس لئے
کس میں یہ جرأت ہے پوچھے تجھسے جو اے بے نیاز
دیر کیوں آباد ہے کعبہ ہے ویراں کس لئے

رحمۃ للعالمین ذلت کی اب حد ہو چکی
جوش میں آتا نہیں رحمت کا عماں کس لئے

کفر کی ظلمت پہ گر غالب نہیں آتا ہے اب
ملّت بیضا کا ہے مہرِ درخشاں کس لئے

اَنتُمُ الاَعلَون بیشک سچ ہے کچھ سمجھے مگر
شرطِ اِن کُنتُم کی ہے اے اہلِ ایماں کس لئے

کچھ خبر بھی ہے حکومت پر جو نازاں آج ہیں
سینۂ مسلم میں ہے محفوظ قرآں کس لئے

شیوۂ تسلیم ہے نوابِ ملّت کا شعار
ورنہ پھر کہلائیں دنیا میں مسلماں کس لئے

---

[۱] سورہ آلِ عمران میں ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (اور سست نہ ہو اور غم نہ کھاؤ اور تم ہی غالب رہوگے اگر تم ایمان والے ہو)

اظہار آرزو

(۵-جنوری ۱۹۱۹ء)

جو گِرد روضۂ اقدس کے یا نبیؐ پھرتے
تلاش خلد بریں مین نہ پھر کبھی پھرتے
فرشتے پھرتے ہیں یوں گرد سبز گنبد کے
پتنگے جیسے کہ ہیں گرد روشنی پھرتے
یہ مسکراتے ہیں غنچے جو صحن گلشن میں
لبوں پہ آپ کے دیکھی تھی کیا ہنسی پھرتے
گران نہو تو ہے اک عرض یہ حضوری میں
حرم میں آپ کے ہیں کیوں یہ مدعی پھرتے
زمانہ پھر گیا سارا تو خیر پھر جائے
ہم آپ ہی کے کرم سے ہیں ملتجی پھرتے
ادھر بھی ساقیِ کوثر وِلا کا جام صفا
یہ آرزو ہے کہ سرشار بیخودی پھرتے
خدا کا شکر ہے نواب ہے سوال اُس سے
کہ درسے جسکے نہ سائل کبھی یوں ہی پھرتے

مکان لامکاں

(۳۱ - جنوری ۱۹۲۰ء)

[ذیل کی نظم میں کعبۂ شریف اور بیت المقدس کی اجمالی تاریخ کی طرف اشارہ ہے۔ کعبہ کو سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بڑے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ سرزمین فاراں یعنی مکہ میں عبادت الٰہی کے لئے تعمیر کیا تھا لیکن رفتہ رفتہ خانۂ خدا بتخانہ بنگیا۔ بیت المقدس کو حضرت سلیماںؑ نے جو حضرت ابراہیمؑ کے چھوٹے بیٹے حضرت اسحٰقؑ کی نسل سے تھے فلسطین میں خداوند یہواہ کی عبادت کے لئے تعمیر کیا تھا لیکن زمانۂ مابعد میں یہود کی شامت اعمال کی باعث رومیوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گیا اور بنی اسرائیل مغضوب ہو کر خانماں خراب پھرنے لگے لیکن رحمت الٰہی نے اصلاح عالم کے لئے نسل اسمٰعیلؑ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور کعبہ کو پھر مرکز توحید بنا دیا]۔

جب لامکاں کا ہمنے دل میں مکاں بنایا
فاران کی زمیں پر تب اک نشاں بنایا

سینا پہ ہم جو پہنچے دیدار کے طلب میں
خوب آپ نے ہمیں واں ایجان جان بنایا

تب قدس کی پہاڑی پر ہم نے راگ گایا
سجدے کے شوق میں پھر اک آستاں بنایا

ہم نے تجھے پکارا تب دار پر بھی چڑھ کر
اس قصہ کو جہاں نے وہم وگماں بنایا

روما کی بھیڑیوں کو تب تو نے ہمیں چھوڑا
زاغ وزغن نے اپنا مسکن وہاں بنایا

روٹھو کے آئے ہم پھر فاران کی زمیں پر
بے زرع تھی جو وادی اسمیں مکاں بنایا

---

۱ لن ترانی ولکن انظر الی الجبل کی طرف لطیف اشارہ ہے ۲ یعنی بیت المقدس جسکو حضرت سلیمانؑ نے تعمیر کیا ۳ واقعہ صلیب حضرت عیسیٰؑ کی طرف اشارہ ہے ۴ رومیوں نے سنہ ۷۰ء میں بیت المقدس کو مسمار کیا منقول ہے کہ رومیوں کے مورث اعلیٰ دو بھائی تھے جنکی پرورش بھیڑیے کی تھی ۵ کعبہ شریف کی طرف اشارہ ہے

غارِ حرا میں تو نے تب خود ہمیں پکارا
لیلیٰ جاں کا ہم کو پھر سارباں بنایا
ہم نے بھی جھوم کر پھر ایسا حدی سنایا
سارے جہاں کو تیرا ہی سبحہ خواں بنایا
خوش ہو کے تو نے جلوہ دکھلایا پھر حرم میں
اور اُسکو تا قیامت دارالاماں بنایا
کعبہ میں ڈھونڈھتا ہے وہ چارسو اُسی کو
جس دل میں لامکاں نے اپنا مکاں بنایا
بیت العتیق دین ہے نواب کعبۃ اللہ
حافظ وہی ہے جس نے سارا جہاں بنایا
یہ دارو گیر کیسی؟ - ہم کون ہیں وہ جانے
جس نے مکان بنایا جس نے زماں بنایا

نامۂ شوق

(۹-فروری ۱۹۲۰ء)

تمنائے زیارت کہہ رہی ہے قلب مضطر سے
رسول اللہ کے در پر چلو اللہ کے گھر سے
نہیں ہے طور۔ رحمت کا سراپا نور یہ در ہے
کہانتک طالب دیدار حضرت آپ کا تر سے
وہ دن آئے گا کب یارب کہ آنکھوں سے لگاؤنگا
حرم کی خاک وہ بادل ہیں جس پر نور کے برسے
نظر اے رحمۃ للعالمیں ہم عاصیوں پر بھی
گذرنے کو ہے سیلاب انقلاب دہر کا سر سے
چمکتا ہے احد کا نور ذات پاک احمدؐ سے
تعلق ماہ تاباں کا ہے روشن مہر انور سے
عجب کیا ہے اگر دریائے رحمت جوش میں آئے
لکھا نواب نے یہ شوق نامہ دیدۂ تر سے

آہ رسا

(۲۹-جنوری ۱۹۳۰ء)

دکھلانے دو بھی چرخ کو تیغ جفا کے ہاتھ — اُمت کی آبرو ہے حبیب خدا کے ہاتھ

آنکھیں دکھا رہی ہے جو گردش ستاروں کی — مسلم ترا معاملہ ہے "والضحےٰ"[1] کے ہاتھ

آسان نہیں ہے ہم پہ فلک ہاتھ ڈالنا — ہاتھوں پہ مو تو نکلے ہیں بیشک خدا کے ہاتھ[2]

پی لی دوا اور درد کی جب دکھ ہوا کوئی — نسخہ عجب لگا ہے ترے مبتلا کے ہاتھ

میں چاہتا تھا چوم لوں قدموں کو آپ کے — میری طرف بڑھا دئے بس مسکرا کے ہاتھ

رحمت کہیگی آپ بھی آئیں حشر میں — جس دم کریں گے آپ شفاعت اٹھا کے ہاتھ

نواب اور کچھ تو نہ عجلت میں ہو سکا — بھیجا ہے تار اشک کا آہ رسا کے ہاتھ

---

[1] آغاز رسالت میں ایک مرتبہ آنحضرت صلعم پر چند روز وحی نازل نہیں ہوئی۔ کفار قریش نے کہنا شروع کیا محمدؐ کو اُسکے رب نے ناراض ہو کر چھوڑ دیا تب کفار کے خیالات کی تردید اور آنحضرت کے تسکین کے لئے حق تعالےٰ نے یہ سورہ والضحیٰ نازل فرمایا۔ اس طرح مسلمانان عالم آجکل اگرچہ خواری دولت کے قعر میں گرے ہوئے ہیں لیکن عنقریب رحمت الٰہی انکی دستگیری کریگی

[2] ید اللہ فوق ایدیہم کی طرف اشارہ ہے

شیشۂ امید

(۳۰ - جنوری ۱۹۳۰ء)

توڑے گا فلک کیا مرے توحید کا شیشہ
توڑے نہ کہیں یہ ترے ناہید کا شیشہ
خود مہر لگائی ہے خداوند جہاں نے
کیا صاف جھلکتا ہے یہ توحید کا شیشہ
زہراب پلانے کی ہے تاکید تو سن لے
ٹوٹیگا فلک اِس تری تاکید کا شیشہ
پڑجائے نہ بال اسمیں کہیں شرک سے ہشیار
نازک ہے بہت دیکھ یہ توحید کا شیشہ
وہ بند علائق سے ہے آزاد جہاں میں
ہے جس کی بغل میں مے تجرید کا شیشہ
دل پاک رہے گرد سے دنیای دنی کے
یہ حشر میں اللہ کی ہے دید کا شیشہ

تعظیم کی جس دل میں مے ناب بھری ہے
ملتا ہے اُسے غیب سے تائید کا شیشہ

بے بحث اُسے مانتے ہیں صاف ہیں جو دل
رکھ دیتے ہیں وہ طاق پہ تردید کا شیشہ

تشکیک کی کچھ حد بھی ہے سائنس کے شیدا
دل ہے کہ جراثیم کی تولید کا شیشہ

لا تقنطوا پڑھ پڑھ کے جو ہے جھومتا نواب
یارب کبھی ٹوٹے نہ یہ اُمید کا شیشہ

تمت بالخیر